پروفیسر محمد منور

تعلیم و تہذیب

پروفیسر حمید احمد خاں کے فکر انگیز خطبات و مقالات

مرحوم پروفیسر حمید احمد خان صاحب کی زیارت تقسیمِ برعظیم کے جلد ہی بعد کسی تقریب میں نصیب ہوئی تھی، تعارف کا فخر مزید کوئی آٹھ دس برس بعد حاصل ہوا۔ مگر میں ان کے مداحوں میں اس وقت بھی شامل تھا جب ابھی انھیں دیکھا تک نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ میرے دو ایک نہایت عزیز دوست اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ میں ان کے شاگرد تھے۔ وہ ان کی محنت، احساسِ فرض، قابلیت، شفقت اور پھر ساتھ ہی نظم و ضبط کے باب میں ان کی سختی کا ذکر بڑے احترام سے کیا کرتے تھے۔ مخلص اور لائق استاد کی سختی طلبہ کو قطعاً بری نہیں لگتی۔ میرے دوست یہ بھی کہا کرتے تھے کہ خاں صاحب بہت پڑھتے ہیں، خوب خوب پڑھاتے ہیں اور جب مہلت ملے پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنے چلے جاتے ہیں۔ شاید اُس دور میں انھیں کوہ پیمائی کا بہت شوق تھا۔

میں نے ہمیشہ ہر اس بزرگ کو اپنا استاد جانا جو میرے کسی دوست کے استاد رہے اور اسی طرح ادب ملحوظ رکھا۔ چنانچہ خاں صاحب کو بھی اسی سبب سے کہ وہ میرے دوستوں کے استاد تھے میں نے خود اپنا استاد تسلیم کیے رکھا اور تاحال شاگردی کا دم بھرتا ہوں۔ مجھے خان صاحب سے باضابطہ تعارف کا شرف اپنے مرحوم اور مشفق استاد مولانا علم الدین سالک صاحب کی بدولت کہیں ۱۹۵۷ یا ۱۹۵۸ میں حاصل ہوا۔ میں ان دنوں گورنمنٹ کالج لائل پور میں درس دیتا تھا۔ لائل پور سے میں لاہور آیا ہی کرتا تھا۔ ہر دورہ عموماً محض ملاقاتی دورہ ہوتا۔ دوستوں سے ملتا، اساتذہ کے حضور سلام عرض کرتا۔ مگر چار بزرگوں سے لازماً ملتا تھا۔ راجہ حسن اختر، سید عابد علی عابد، خواجہ صلاح الدین (کیمیکل ٹیکنالوجی پنجاب یونیورسٹی) اور

مولانا علم الدین سالک ۔ ان چاروں میں باہم کوئی ربط نہ تھا، ان میں سے ہر ایک کی اپنی الگ دنیا تھی۔ مگر حق یہ ہے کہ اپنے اپنے انداز کے بے مثل لوگ تھے ۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ اور پھر سول لائنز میں جب بھی میں مولانا سالک صاحب کی تلاش میں پہنچتا تو خان صاحب سے بالعموم ملاقات ہو جاتی تھی ۔ پھر باتیں بھی ہوتی تھیں اور دلچسپ ۔ بڑی جلدی پتہ چل گیا کہ خان صاحب کی طبیعت میں اللہ نے ظرافت کا جوہر بھی بقدرِ فراواں ودیعت کیا ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی ظرافت میں بھی ایک رکھ رکھاؤ تھا۔

جب میں ۱۹۶۱ میں گورنمنٹ کالج لاہور سے منسلک ہو گیا تو پھر خان صاحب کی باتیں سننے کا موقع بار بار ملنے لگا ۔ آج فلاں تقریب ۔ کل فلاں ۔ کرنل مجید ملک مرکزی اردو بورڈ سے وابستہ تھے ۔ ابو الاثر حفیظ صاحب ان دنوں کراچی میں مقیم تھے مگر اکثر آتے تھے ۔ ان دو بزرگوں کی بدولت خان صاحب سے ملاقات مزید بڑھی اور ان کی باتیں، بے تکلف تر باتیں، شگفتہ اور لطیف پیرایہ باتیں سننے کا موقع جلد جلد ملنے لگا ۔ پیر حسام الدین راشدی بھی ان دنوں یہیں تھے، کبھی کبھار وہ مجھے پکڑ لے جاتے ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ گو میں یہ دعویٰ کبھی نہ کر سکا کہ میں خان صاحب کے دوستوں میں شامل تھا تاہم میں نے ان کی بے تکلف گفتگو بہت سنی ہے ۔ تقریریں اور خطبے اس کے علاوہ ۔

میں نے گفتگو اور باتوں کا ذکر بار بار کیا ہے ۔ وہ بے سبب نہیں ہے ۔ اس لیے کہ ان کا طرزِ تحریر ان کی گفتگو ہی کا پرتو ہے ۔ سید عابد علی عابد، سید وقار عظیم اور پروفیسر حمید احمد خاں کی گفتگو اور تحریر کی زبان تقریباً ایک ہی ہے ۔ ورنہ عام طور پر گفتگو اور تحریر کی زبان میں قابلِ لحاظ فرق ہوتا ہے ۔ میں اپنے کئی ایسے دوستوں اور کرم فرماؤں کو بھی جانتا ہوں جو اچھی خاصی چٹپٹے دار گفتگو کرتے ہیں لیکن قلم پکڑتے ہی قطعاً منقطع ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ یہاں منقطع سے اس کے مروج معنوں کے علاوہ اپنی ذات سے قطع تعلق کی کوشش بھی مراد ہے ۔

خاں صاحب کے بارے میں مجھے معلوم نہیں کہ املا کراتے تھے یا بقلم خود تحریر فرماتے تھے، مگر ان کی تحریری عبارت ان کی تقریری عبارت سے بہت ہی قریب ہے ۔ جب ان

کی کوئی تحریر پڑھتا ہوں تو کانوں میں ان کی آواز میٹھی میٹھی گھنٹیاں بجانے لگتی ہے۔ تقریباً یہی عالم "تعلیم و تہذیب" میں مشمولہ خطبات و مقالات کا ہے۔ میں نے اس کتاب کی عبارت بھی جتنی آنکھوں سے دیکھی تقریباً اتنی ہی کانوں سے سنی۔

خاں صاحب کے دوستوں میں متضاد طبائع اور مخالف نظریات کے حامل اساتذہ و ادبا اور شعرا شامل تھے۔ لہذا ایک اعتبار سے انھیں وسیع المشرب قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر بعض اوقات وسیع المشرب سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جس کا اپنا کوئی مشرب ہی نہ ہو۔ یہاں ایسا معاملہ ہرگز نہیں۔ خاں صاحب کا اپنا مشرب واضح تھا۔ ان کا اپنا نظریہ عیاں تھا۔ ان کا اپنا عقیدہ معین تھا۔ وہ خدا پرست تھے۔ موحّد تھے۔ ان کے وجود کا ذرہ ذرہ حُبّ وطن سے سرشار تھا۔ ان کو اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا۔ انھیں پاکستان سے والہانہ محبت تھی اور انھیں پاکستان کی اساس یعنی اسلام سے عشق تھا۔ وہ اپنی اس کتاب میں "قومی آزادی اور تہذیب نفس" کے موضوع پر اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں خطبہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس منزل پر ہمیں آزادی کے اس انعام عظیم کے لیے جو گزشتہ سال ہمیں اپنے حین حیات میں دوسری مرتبہ عطا ہوا، خدائے بزرگ و برتر کا شکر بجالانا ہے --- ہم گوجرانوالہ میں تعلیمی انعامات کا یہ جلسہ اس لیے منعقد کرسکے ہیں کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہمارے غازیوں اور شہیدوں کی قوتِ بازو کے ذریعے سے آزادی کا بے بہا انعام لاہور اور سیالکوٹ کی سرحدوں پر از سرِ نو ہمارے دامن میں ڈال دیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دراصل ہماری سرحدیں ہی ہمارے شہیدوں کے خون سے لالہ رنگ نہیں ہوئیں، ہماری خاکِ وطن کے ذرے ذرے پر نورِ ایمان کی بارش ہوئی ہے۔ اگر ہماری آنکھیں دیکھ سکیں تو ہمیں پاکستان کی پوری سرزمین غازیوں کے لہو سے وضو کرتی ہوئی نظر آئے، اگر ہمارے کان سن سکیں تو اپنے پاؤں تلے کی مٹی میں سے شہیدوں کی پکار سنائی دے کہ ہم نے تو جان کی شہادت دے کر تمھاری آزادی کا حق ثابت کر دیا، اب اس آزادی کی بنیادوں پر ایک بہتر زندگی کی عمارت کھڑی کرنا تمھارا کام ہے۔[۵]"

---

[۵] تعلیم و تہذیب، ص ۲۵۱، ۲۵۲

تعلیم و تہذیب میں شامل خطبات و مقالات کا خطاب بڑی حد تک درس گاہوں سے ہے۔ جو خطبات ریڈیو سے نشر ہوئے اور وہ عبارات بھی جن کا تعلق صحافیوں یا طلبہ کے انٹرویو سے ہے، بالعموم اسی موضوع کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں استاد اپنے شاگردوں کے لیے بہتر سے بہتر نمونۂ اخلاق ہوں۔ استاد فرض شناس ہوں تاکہ شاگرد واقعی ان کے چیلے بن کر رہیں اور استاد شاگرد کا رابطہ دو متحارب گروہوں کا سا نہیں ہونا چاہیے۔

ان خطبات میں جو چیز سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ہے وہ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان اس امر پر باصرار و تکرار زور دیتے رہے کہ جب تک پاکستان کی قومی زبان میں تعلیم نہیں دی جاتی ہمارے طلبہ کے ذہن مقفل رہیں گے۔ وہ رٹا لگاتے ہیں اور پاس ہو جاتے ہیں۔ گویا امتحان ان کی ذہانت اور سوجھ بوجھ کا امتحان نہیں، یہ تو نامفہوم معلومات کو پرچے پر اُگل دینے والی قوتِ حافظہ کا امتحان ہے۔ خان صاحب کہتے ہیں:

"کسی امتحان کا کوئی پرچہ اٹھا کر دیکھ لیجیے، آدھے سے زیادہ سوالات ویسے ہوں گے جو ہماری واقفیت کا نہیں، محض حافظے کا امتحان لیتے ہیں۔"

انھوں نے تعلیم کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:

"واضح رہے کہ کسی نئے نظامِ تعلیم کی کامیابی صرف اس بات پر منحصر نہیں کہ وہ طالب علموں کو معلومات کا وافر سرمایہ بہم پہنچاتا ہے بلکہ اس بات پر بھی ہے کہ معلومات کا یہ سرمایہ زندگی کی حقیقی قدروں سے واقعی کوئی رشتہ رکھتا ہے یا نہیں[۲]۔"

خاں صاحب قومی زبان کو معاشرتی زندگی کی ایک اساسی اور بنیادی ضرورت جانتے تھے۔ انہی کے الفاظ میں "قومی زبان کوئی بے کار سا کھلونا نہیں کہ جی چاہا تو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ یہ اجتماعی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے جس کو پورا کیے بغیر معاشرے کی تشکیل و تکمیل نہیں ہوتی[۳]۔"

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ملکی وحدت کے لیے ایک ہی زبان کا قومی زبان ہونا لازم ہے

---

۲ تعلیم و تہذیب، ص ۲۶ ۳ ایضاً، ص ۱۶۱

اور یہ بات بھی انھوں نے بالاصرار بار بار کہی ، یہاں ان کے چند جملے درج کیے جاتے ہیں۔

" قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی اس تجویز پر عمل اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمارا ملک ابھی تک قومی اتحاد اور سیاسی استحکام کا محتاج ہے۔ قومی زبان میں تعلیم اس خلا کو پورا کرنے میں مدد دے گی۔ مجھے تسلیم ہے کہ ایک سے زیادہ قومی زبانوں کے ہوتے ہوئے بھی بعض ملکوں کا سیاسی استحکام ممکن رہا ہے لیکن ایسی صورتوں میں جغرافیہ اور بعض دوسرے عوامل خود بخود قومی اتحاد کو مضبوط کر دیتے ہیں، ورنہ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کی بقا ایک ملک اور ایک زبان کا تقاضا کرتی ہے [۴۵]"

پھر ہم نے دیکھا اور خود پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے بھی دیکھا کہ جب اردو کے ساتھ بنگلہ کو بھی قومی زبان قرار دے دیا گیا تو آگے چل کے نتیجہ کیا نکلا؟ ایک صوبائی زبان کے الگ قومی زبان بن جانے سے اس زبان کے بولنے والوں کو اپنے ایک علیحدہ قوم ہونے کا احساس ہونے لگا اور انداز نظر بدلنے لگا جس سے پاکستان کے بدخواہوں نے اندر سے بھی اور باہر سے بھی مختلف اصلی اور وہمی شکایات کو فتنے کی آگ میں تبدیل کر دیا۔ اس افراتفری کے عالم میں جن نوجوانوں نے مشرقی پاکستان میں ملکی وحدت کے لیے ہر طرح کی قربانی اپنی عزیز جانوں سمیت پیش کی، وہ عموماً انھی دینی مدارس کے طلبا تھے جن کی زبانِ تدریس اردو تھی۔ یہ بات میں مشرقی پاکستان کے ایک سے زیادہ قابلِ اعتماد اور کٹر پاکستانی حضرات کی زبانی سن کر لکھ رہا ہوں۔

خاں صاحب ہمیشہ مصر رہے کہ اردو کو بحال رکھیے اور اسے ترقی دیجیے اس لیے کہ اردو کا تہذیبی پس منظر اسلامی ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اردو کو زمانۂ حال میں بھی ترکی، فارسی اور عربی زبان، ادب اور علوم کے سرچشموں سے بھرپور فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے کہ تاحال وہ سرچشمے خشک نہیں ہوئے۔

علاقائی زبانوں کے باب میں وہ بڑے محتاط تھے۔ وہ علاقائی زبانوں کی ترقی

---

[۴۵] تعلیم و تہذیب، ص ۸۰

چاہتے تھے مگر خواہاں تھے کہ وہ اپنی حد میں رہیں اور قومی زبان کو جو قومی وحدت کے لیے ضروری ہے زک نہ پہنچائیں۔ اس باب میں وہ رقم طراز ہیں:

"تاریخ کا قدیم دستور ہے کہ وہ زبان کے شیرازے کے ساتھ حکومت کا شیرازہ بھی برہم کرتی ہے۔ لاطینی مسیحیت اور لاطینی زبان کے زوال کی داستان بڑی عبرت آموز ہے[۵]"

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا خاں صاحب کی توجہ بار بار اردو کی قومی حیثیت منوانے کے لیے جوش زن ہوئی ہے۔ وہ جاپان کی مثالیں دیتے ہیں، انڈونیشیا کی پیروی کرنے کو کہتے ہیں، فن لینڈ کی نو تعمیر قومی زبان کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر جن کو وہ سنانا چاہتے ہیں وہ بے اعتنائی برتتے رہے۔

بعض ترقی پسند اور روشن خیال کہلانے کے حریص "خواہ مخواہان قوم" ایک سے زیادہ سرکاری زبانوں کا جواز ثابت کرنے کے لیے روس کی مثال پیش کر دیا کرتے ہیں۔ خان صاحب ان کو یاد فرما کر لکھتے ہیں:

"لسانی بنیادوں پر پاکستان کی تقسیم چاہنے والے بارہا روس کا ذکر کرتے ہیں کہ وہاں کی بیسیوں علاقائی زبانوں کو سرکاری زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے۔ اس قسم کے بیانات محض اپنے آپ کو (یا دوسروں کو) فریب دینے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ روس میں روسی زبان کے سر پر جو چتر شاہی سایہ افگن ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ تمام قومی اور بین الاقوامی کاروبار اسی زبان کے ذریعے طے ہوتا ہے۔ علاقائی بولیوں کی خود مختاری کی حقیقت اسی واقعے سے کھل جاتی ہے کہ ترکستان کے مسلمانوں کے نام تک ابراہیموف، احمدوف یوسفوف کی شکل اختیار کر گئے ہیں"[۶]

اس ضمن میں ایک واقعہ بھی سن لیجیے۔ کوئی دو برس قبل مکتبۂ کاروان لاہور میں ایک روسی مسلمان ادیب اور محقق تشریف لائے۔ اس مکتبہ میں ایک ضخیم مجموعہ روسی علاقے کے مسلمان شعرا کی بعض نظموں کے انگریزی تراجم کا موجود تھا۔ چودھری عبدالحمید صاحب

---

۵ تعلیم و تہذیب، ص ۱۸۸ ۶ ایضاً

مالکِ مکتبہ سے بعض شعرا کے نام پڑھے نہ جاتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مہمانِ گرامی سے عرض کیا کہ جن جن اسما کے آگے نشان لگا یا گیا ہے وہ پڑھ دیں۔ انھوں نے بعض نام پڑھ دیے اور بعض ان کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔ میں بھی یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ چوہدری صاحب بولے مسلمان نام ہیں مگر خدا جانے کیسے لکھے ہوئے ہیں کہ پڑھے نہیں جاتے۔ وہ روسی مسلمان ادیب اور محقق بولے کہ بھائی ہماری ریاستوں کی علاقائی زبانوں کا رسم الخط فارسی یا عربی نہیں، روسی ہے۔ اور علاقائی لہجوں میں جو لفظ جس طرح بولا جاتا ہے اسی طرح لکھ دیا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ اسمائے علم بھی اس طرح نہیں لکھے جاتے جس طرح اصلاً ہیں۔ مثلاً محمدؐ کہیں محمد بولا جاتا ہے، کہیں ماخمت، کہیں مامد، کہیں محدو غیرہ۔ تو اصل نام محمدؐ نہیں لکھا جاتا بلکہ جس طرح جس علاقے کا لہجہ ہو ویسا لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات ہم اسم محمدؐ بھی نہیں پہچان سکتے۔

غرض یہ کہ اردو زبان کا مسئلہ خاں صاحب کے نزدیک اگر قوم کا اہم ترین نہیں تو وہ ایک اہم ترین مسائل میں سے ضرور تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے خاں صاحب کے نزدیک اردو اس برِّعظیم کے مسلمانوں کی تہذیبی روایت کی امانت دار ہے۔ اور بقول کسے کسی قوم کا اپنی تمدنی روایت سے کٹ جانا ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کا اچانک حافظے سے محروم ہو جانا۔ خاں صاحب اس قبیل کے جملہ افراد کو جو صرف انگریزی کو کافی و شافی جانتے ہیں کنوئیں کے مینڈک قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"غیر زبان کے بنے بنائے کنوئیں میں چکر کاٹ کر وہ اپنے آپ کو محفوظ پاتے ہیں لیکن قومی زبان کے بحرِ بے کراں کی زندگی بخش موجوں پر تیرنے اور ذہنی آزادی کی لامتناہی فضا میں سانس لینے کے تصور ہی سے ان کے ننھے ننھے دل کانپ جاتے تھے۔[۵۷]"

خاں صاحب نے وطن کی تمدنی زندگی کے اس میدانِ کارزار میں، جسے قومی زبان کہتے

---

۵۷ تعلیم و تہذیب، ص

ہیں، بڑی جگرداری سے جہاد کیا اور بلاکم وکاست دل کی بات کہی۔ یہ مسئلہ تاحال فیصلہ طلب ہے کہ آخر علاقائی زبانوں کی حد کیا اور کہاں تک ہے۔ یہ طے ہو جانا ضروری ہے کہ اس حد تک علاقائی زبان لازمی یا وسیلۂ اظہار ہوگی۔ اور اس حد سے آگے صرف قومی زبان کی قلم رو ہوگی۔ اگر صوبے میں قومی زبان کے دوش بدوش صوبائی زبان بھی چلتی رہی تو بین الصوبائی زبان انگریزی ہی ہوگی جو بہرحال پورے پاکستان کی عوامی زبان کبھی نہ بن سکے گی۔ اور اگر اردو زبانِ رابطہ نہ رہی تو ایک صوبہ دوسرے صوبے سے کٹ جائے گا اور پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچے گا۔

اس کتاب کا عمومی اسلوب متعین ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا خاں صاحب کی گفتگو کا تھا۔ مگر یہ کڑی متانت نہیں۔ یہاں وہاں ظرافت کی پھلجڑیاں موجود ہیں۔ مثلاً ان کا مضمون "ناکام طالب علم کی آپ بیتی" دیکھیے یا "مہذب وحشی" ملاحظہ فرمایئے یا اسلامیہ کالج کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد کی سالانہ روداد دیکھیے، جس میں اپنی ہاکی ٹیم کی شاندار ہار کو مزاح کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:

"ہاکی میں ہمارا اس سال کا کھیل ایک عجیب وغریب لطیفے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے پہلے دن سے شکست کھانے کا تہیہ کچھ اس خلوص سے کر لیا کہ یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں ایک میچ ایسا بھی آیا جس میں ہم دس گول سے ہارے۔ یہ ایک ایسا غیر معمولی واقعہ تھا کہ میں کچھ دیر اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ اس شکست سے ہماری ٹیم نے کالج میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ لیکن بعض مورخین نے مجھے یقین دلایا ہے کہ پچیس برس پہلے ہم نے ایک اور یادگار موقعے پر ہاکی میں گیارہ گول سے شکست کھائی تھی۔"